**فیصل ریحان**
پی ایچ-ڈی سکالر (اُردو)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
**ڈاکٹر عزیز ابن الحسن**
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

# گل خان نصیر کی اُردو شاعری

Gul Khan Naseer was a prominent Baloch poet, critic, historian and a well known politician. He was one of those poets and writers, who also played an active role in politics. Gul Khan Naseer is said to be the last important poet of Balochi. Interestingly, he also created some works in Urdu and Brahvi as well. This article represents a research base critical analysis of his Urdu poetry. The study shows his power of expression and socio-political landscape of Baluchistan in his Urdu poetry in detail.

بلوچستان میں اُردو شعری روایت کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں محمد حسن براہوی سے ہوتا ہے۔ مگر اسے پایۂ اعتبار بیسویں صدی کے آغاز میں ملا۔ جن لوگوں نے یہاں اردو شعری روایت کو پائیدار بنیادوں پر استوار کیا۔ ان میں سید عابد شاہ عابد، محمد حسین عنقا، یوسف عزیز مگسی اور گل خان نصیر شامل ہیں۔ یہ امر افسوناک ہے کہ گل خان نصیر کا تذکرہ بلوچستان کی اردو شاعری پر لکھی گئی تحقیقی وتنقیدی کتب کے حاشیے پر ہی ملتا ہے۔ حالانکہ شاعری اوردیگر ادبی کمالات کی بناء پر وہ اپنے ہمصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

گل خان نصیر(۱۹۱۴-۱۹۸۳) نہ صرف بلوچستان بلکہ پاکستان کے ایک قد آور سیاستدان، ترقی پسند دانشور، مؤرخ، بلوچی ادب کے نقاد اور اُردو و بلوچی بالخصوص بلوچی کے اہم ترین شاعر تھے۔ ان کی فعال سیاسی زندگی، سرگرم سماجی شخصیت، مدبرانہ قیادت اور ان سب کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے ادبی وعلمی کمالات نے بلوچستان کے ادبی اور سیاسی افق پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کی جدید ادبی اور سیاسی تاریخ گل خان نصیر کے تذکرہ کے بغیر نامکمل رہے گی۔ انہیں جدید بلوچی شاعری کا ملک الشعراء کہا جاتا ہے اس کے علاوہ وہ ایک اہم نثر نگار کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات پر ان کی کل تصانیف کی تعداد ۲۰ سے زائد ہے۔

گل خان نصیر نے اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا اُردو اور براہوی میں شعر گوئی سے کی۔ انہوں نے جدید تعلیم کے حصول کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ بھی لیا تھا۔ مگر پھر آشوب چشم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انہیں تعلیم کو خیر باد کہہ کر واپس بلوچستان جانا پڑا۔ (۱) مگر انہوں نے اُردو شاعری کا سلسلہ جاری رکھا۔ قیامِ لاہور نے جوکہ مختصر عرصہ پر مشتمل تھا، ان کی فکر ونظر میں جو وسعت

اور کشادگی پیدا کی تھی اس کی جھلک ان کی اردو شاعری میں اسلوب، ہیئت اور موضوعات کی سطح پر بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ چونکہ ان کی اُردو شاعری ایک طویل عرصے تک کتابی صورت میں یکجا ہوکر سامنے نہ آ سکی تھی۔ لہٰذا اس کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ اب تک نہیں کیا گیا۔ جو ایک آدھ کاوش کی بھی گئی تو وہ مختصر تعارفی مضمون تک محدود رہی۔ظاہر ہے کہ لکھنے والوں کی بحث ان ہی نظموں تک رہی جن تک ان کی رسائی بہ آسانی ہوسکی۔ یہی صورت ان پر لکھی گئی ان ایک دو کتابوں میں نظر آتی ہے جو اب تک سامنے آئی ہیں۔ پھر چاہے وہ جامعاتی سطح پر لکھا گیا ایم فل کا مقالہ ہو یا کسی ادارے کی طرف سے گل خان نصیر کے فن وشخصیت پر شائع کی گئی کتاب ہو۔ ایسی کتابوں اور مضامین میں گفتگو کا بیشتر حصہ ان کی سیاسی جدوجہد کو موضوع بحث بناتا نظر آتا ہے۔ ان کی اُردو اور بلوچی شاعری کے حوالے سے ان کے فن کا خالصتاً تنقیدی مطالعہ کم ملتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ مواد ومتن کی عدم دستیابی سے زیادہ ان کے ناقدین میں تنقیدی بصیرت کی کمی، تحقیق سے عدم دلچسپی، غیر جانبداری کا فقدان اور جلد بازی جیسے عناصر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گل خان نصیر کے سیاسی قدوقامت ( بلوچستان میں دو چار لوگ ہی ان کی ہمسری کر سکتے ہیں ) سے قطع نظر ان کی ہمہ جہت ادبی شخصیت اس قدر پہلودار اور دلچسپ ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی وتنقیدی کام کے خاطرخواہ امکانات موجود ہیں۔ گل خان نصیر اپنی سیاسی سرگرمیوں اور انقلابی افکار کے باعث اکثر حکمرانوں کے عتاب کا نشانہ بنے اور کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے۔ مگر 'زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی' کے مصداق دورانِ قید بھی انہوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ نصیر کی کئی شعری ونثری تصانیف ایسی ہیں جو زمانہ اسیری میں لکھی گئیں۔ ان کی قید و بند کا زمانہ خاصا طویل رہا انہوں نے خود ایک موقع پر کہا:

> ''۱۹۲۱ سے ۱۹۷۳ء تک مجھے کئی بار جیل جانا پڑا۔ غالباً اس عرصے میں کوئی سال ایسا نہیں گیا جس میں مجھے جیل کی زیارت نہیں کرنی پڑی۔'' (۲)

گل خان نصیر نے شاعری کی ابتدا اُردو میں شعر کہنے سے کی اور ایک عرصہ تک وہ اُردو میں ہی شعر کہتے رہے مگر پھر یوں ہوا کہ انہوں نے اُردو میں شعر کہنا ترک کردیا اور اپنی مادری زبان بلوچی کو ذریعہ اظہار بنا لیا۔ ان کے مزاج میں یہ تبدیلی کیوں آئی اس کی بنیاد وہ واقعہ بنا جب انہیں ۱۹۴۲ء میں باچا خان اور خدائی خدمت گاروں نے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے چارسدہ (خیبر پختونخواہ) بلایا تھا۔ نصیر کے بقول:

> ''میں اور میرے ساتھی گئے وہاں تقریباً کانفرنس کی پوری کارروائی پشتو میں ہوئی۔ اگرچہ میں پشتو سے کچھ زیادہ بلد نہ تھا تاہم میں ان کے اس عمل سے بہت متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ تمام نظمیں بھی پشتو میں پڑھ کر سنائی گئیں پھر مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں بھی شاعر ہوں اپنا کلام سناؤں۔ میں نے عذر کیا کہ میں اس وقت تیار نہیں ہوں اگلی نشست کے دوران سناؤں گا میرا یہ عذر مان لیا گیا۔ چنانچہ کانفرنس کی اس نشست کے بعد میں نے دریا کا رخ کیا۔ میں نے سوچا کہ رب جس طرح بھی ہو مجھے اپنی زبان میں شاعری کرنی ہے اور اپنی زبان ہی میں کانفرنس میں اپنی شاعری سناؤں گا۔ چنانچہ دریا کے کنارے میں نے ایک طویل بلوچی نظم 'بیا اے بلوچ' (آ اے بلوچ) تخلیق کی اور کانفرنس کی اگلی نشست میں بہت جوش اور جذبے سے سنائی اس طرح میں نے بلوچی شاعری کی ابتداء کی۔'' (۳)

بعد میں یہ نظم ان کے پہلے مجموعہ کلام گل بانگ میں اسی عنوان کے تحت شائع ہوئی۔ گل خان نصیر نے اس نظم کی تخلیق کے بعد اپنی توجہ بلوچی میں شعر کہنے پر مرکوز کر دی۔ اور جلد ہی اس قدر شاعری تخلیق کرلی کہ وہ ایک کتاب کی صورت اختیار کر گئی۔ بعض

لوگوں کے نزدیک 'بیا اے بلوچ' نصیر کی بلوچی میں پہلی نظم نہیں ان کے مطابق وہ اس نظم کی تخلیق سے پہلے ۱۹۴۰ء میں بلوچی میں ایک نظم 'گوک پروش' کے شہیدوں کے بارے میں لکھ چکے تھے (۴) تاہم واحد بخش بزدار کی یہ بات درست نہیں ہے کہ چارسدہ کے واقعہ کے بعد ''وہ اُردو شاعری کو چھوڑ چھاڑ کر مکمل طور پر بلوچی شاعری کی طرف راغب ہوگئے''۔ (۱۱۱) کیونکہ کارواں کے ساتھ میں شامل کلام کے نیچے درج تاریخوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا بیشتر اُردو کلام بعد کے زمانے سے متعلق ہے۔

گل خان نصیر خان کا اُردو کلام ان کی زندگی اور بعد میں بھی وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتا رہا۔ لیکن شاید وہ اسے کتابی صورت دینے پر قصداً راغب نہیں تھے۔ کیونکہ ان کے کئی شعری مجموعے اور دیگر نثری تصانیف یکے بعد دیگرے شائع ہوکر سامنے آتے رہے۔ مگر انہوں نے اپنی اردو شاعری کو کتابی شکل دینے کی کوشش نہ کی۔ تاہم اس کا مسودہ ان کے پاس موجود رہا۔ جو ان کی وفات کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک سامنے نہیں آ سکا اور ان کی صاحبزادی گوہر ملک جو بلوچی زبان کی ایک اہم افسانہ نگار کے طور پر ابھی شناخت رکھتی تھیں کے پاس منتظر اشاعت رہا۔ وہ بھی اسے اپنی رندگی میں زیورطبع سے آراستہ ہوتے نہ دیکھ سکیں۔ ان کی وفات کے بعد گل خان نصیر کا اُردو مجموعہ کلام کارواں کے ساتھ کے عنوان سے ڈاکٹر شاہ محمد مری نے ۲۰۱۱ء میں مہر در پبلیکیشنز کوئٹہ سے شائع کیا اور یوں آخر کار بلوچی کے آخری سب سے بڑے شاعر کا اُردو شعری مجموعہ قارئین تک پہنچا۔ اس مجموعے میں ان کی اُردو کی ۳۹ تخلیقات، پانچ بلوچی نظموں کے اُردو تراجم جبکہ دس فارسی نظمیں کی شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ اور تعارفی مضمون بعنوان 'گل خان نصیر کی شاعری' بالاترتیب شاہ محمد مری اور یوسف گچکی کے قلم سے ہیں۔ اس مجموعے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں موجود مواد کو سن وار شائع کیا گیا ہے۔ شاہ محمد مری کے بقول خود شاعر نے مسودے میں ہر تحریر کے نیچے اُس کی تاریخ تخلیق معہ دن مہینہ، سال درج کردی تھی۔ البتہ بعض نظموں کے نیچے تاریخ درج نہیں ہے۔ اس تاریخ وار اندراج سے جہاں نظموں کے عرصہ تخلیق کا پتہ چلتا ہے وہاں اس سے شاعر کے ذہنی وفکری ارتقا کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا اس مجموعے میں گل خان نصیر کا سارا اردو کلام شامل ہے؟ اس نہایت اہم سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا۔ یعنی کارواں کے ساتھ میں نصیر کا کُل اُردو کلام شامل نہیں ہے۔ ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ گل خان نصیر کی کچھ نظمیں اس مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہیں۔ اس میں شامل نظموں کی کُل تعداد ۳۹ ہے۔ واضح رہے کہ یہ بحث صرف اُردو تخلیقات سے متعلق ہے۔ اس میں اُن کی بلوچی نظموں کے اُردو تراجم اور فارسی نظمیں شامل نہیں ہے۔ جبکہ آغا محمد ناصر نے ان کی نظموں کی کل تعداد ۴۷ بتائی ہے۔ ان کے بقول ''میر گل خان نصیر کا اُردو کلام سینتالیس (۴۷) نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۳ سے ۱۹۵۰ء کے عرصے میں لکھی گئی اور ان کی بیٹی کے پاس محفوظ ہیں۔'' (۵)

آغا محمد ناصر نے اپنی کتاب بلوچستان میں اُردو شاعری کی تسوید کے دوران شاید یہ مسودہ دیکھا تھا جس کا اظہار انہوں نے درج بالا سطروں میں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نصیر کی کم از کم آٹھ (۸) نظمیں اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ آغا ناصر نے اپنی کتاب میں نصیر کی کئی نظمیں ان کے تعارف کے ساتھ شامل کی ہیں۔ ان میں سے تین غزلیں ایسی ہیں جو کارواں کے ساتھ میں شامل نہیں ہیں۔ ان تینوں غزلوں کے الگ الگ مطلع ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

اٹھ کے اب دنیا میں پھر جینے کا ساماں کیجیے
آج اس کانٹے کو ہمرنگِ گلستاں کیجیے

غیروں سے شکایت یہ مرا کام نہیں ہے
سچ بات ہے اپنوں سے بھی آرام نہیں ہے
اُٹھ اے قوم بلوچی اٹھ یہ اندازِ دل ربائی
دکھا دے آج پھر دنیا کو وہ شان مسیحائی (۶)

لال بخش رند نے ان کی ایک اور نظم کا پتہ دیا ہے ان کے بقول پاکستان بننے سے ایک ماہ قبل یعنی جولائی ۱۹۴۷ء میں انہوں نے 'پاکستان کے معنی پنجابی راج' کے عنوان سے اُردو میں ایک نظم لکھی تھی۔ (۷) یہ نظم بھی زیرِ نظر مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ لال بخش رند کے بقول اس نظم میں میر گل خاں نصیر نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:

''پاکستان کے قیام سے برصغیر کی ساری مسلمان آبادی کو فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اسلام کے نام پر پنجاب کے کچھ لوگ ایک علیحدہ ملک قائم کرنا چاہتے ہیں چونکہ پاکستان میں سب سے بڑا اور قومی صوبہ پنجاب ہوگا۔ لامحالہ وہی باقی صوبوں پر راج کرے گا اور چھوٹے صوبے ہمیشہ اس کے مطیع رہیں گے''۔ (۸)

دیکھا جائے تو یہ خیال اس وقت ہندوستان کے کئی مسلمان راہنماؤں نے ظاہر کیا تھا۔ اس حوالے سے جو اہم ترین نام ذہن میں آتا ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے جو ایسی ہی رائے رکھتے تھے۔ پاکستان کے موجودہ حالات، صوبائی حق خود مختاری اور معاشی حقوق کے تناظر میں نصیر کا یہ خیال ایسا بے جا بھی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تک وفاقی سطح پر حکومت سازی کا فیصلہ پنجاب ہی کرتا ہے۔ جس سے دیگر صوبوں میں احساس محرومی یا شراکت اقتدار سے محرومی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جو بلوچستان اور سندھ میں اس وقت اپنی انتہائی سطح کو چھو رہا ہے۔ بلوچستان کی حالیہ شورش کی ایک بڑی وجہ یہی احساس محرومی ہے۔ خیر یہ تو جملہ ءمعترضہ تھا۔ یہ مضمون اس بحث کا متحمل نہیں۔ آمدم برسرِ مطلب اصل بات تو نصیر کا اس موضوع پر ایک نظم لکھنا ہے۔ جس سے وہ اپنے سیاسی شعور کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ مسئلہ آج تک زیرِ بحث چلا آتا ہے۔ اب اگر گل خاں نصیر نے واقعی اس موضوع پر نظم لکھی تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اور اس طرح کی دیگر نظمیں ان کے مجموعہ کلام میں شامل کیوں نہیں۔ اس حوالے سے دیباچے میں بھی کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ (۹) حالانکہ ضروری تھا کہ ان کا تمام دستیاب اردو کلام شاملِ اشاعت کر دیا جاتا تاکہ قارئین کو ان کا کُل کلام میسر آجاتا۔ اس کے حُسن وقبح کا فیصلہ ان کے قاری اور ناقد کرتے۔ اگر ان کا کچھ کلام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہے یا اسلامی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ایسے کلام سے ان کے طبعی میلان اور ذہنی ارتقا کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی۔ اس سے گل خاں نصیر کی بعد میں ابھرنے والی انقلابی شخصیت پر کچھ فرق نہ پڑتا۔

گل خاں نصیر کی اُردو شاعری کے بارے میں ایک اور نکتہ حل طلب ہے۔ وہ یہ کہ اس کا دورانیہ متعین نہیں ہے۔ قرآئن کے مطابق انہوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل سے اُردو شاعری کا آغاز کیا تھا اور نوشہرہ والا واقعہ رونما ہونے کے بعد ان کی توجہ اُردو سے بلوچی شاعری پر مبذول ہو کر رہ گئی تھی۔ یوسف رجا چشتی نصیر کی اُردو شاعری کے زمانے پر بحث کرتے ہوئے قطعی طور پر لکھتے ہیں ''گل خاں نصیر کی اُردو شاعری ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۰ء تک کے زمانے کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔'' (۱۰) آغا محمد ناصر نے بھی ان کی شاعری کا یہی زمانہ تحریر کیا ہے جس کا حوالہ آگے آچکا ہے۔ جبکہ عبداللہ جان جمالدینی اس بارے میں کہتے ہیں کہ ''انہوں نے براہوی شعر تب کہنے شروع کیے جب وہ سکول کی نچلی جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے جب کالج پہنچے تو

انہوں نے اُردو میں شعر کہنا اختیار کیا۔'' (۱۱)

جہاں تک گل خاں نصیر کی شاعری کے آغاز کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء براہوی زبان میں شعر کہنے سے کی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب مشہد نا جنگ نامہ جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی اور جو میر نصیر خاں نوری کی ان لڑائیوں کے بارے میں ہے جسے بلوچ تاریخ میں 'جنگِ مشہد' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس منظوم تاریخ کو گل خاں نصیر نے اس وقت مکمل کیا تھا جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔(۱۲) اُن کی اُردو شاعری کا آغاز کالج ہی کے زمانے سے ہوا۔ کالج کی تعلیم کے لیے گل خاں نصیر نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا تھا لیکن سیکنڈ ائیر کے دوران آنکھ کی سخت تکلیف کے باعث انہیں کالج چھوڑ کر واپس کوئٹہ جانا پڑا تھا۔ اور یہ زمانہ ۳۲۔۱۹۳۱ کا تھا۔ (۱۳) یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی اُردو شاعری کا آغاز ۳۱۔۱۹۳۰ میں ہوا۔ تاہم ان کے مجموعہ کلام کارواں کے ساتھ میں جو پہلی غزل یا غزل مسلسل ملتی ہے۔ ان کے نیچے درج تاریخ تخلیق ۲۵ فروری ۱۹۳۴ء ہے۔ یہ ان کی معروف ترین غزل ہے۔ اسے غزل مسلسل کہنا بہتر ہوگا ان کی اس غزل کو نہ صرف اپنے زمانۂ تخلیق میں قبولیت عام کی سند ملی بلکہ یہ غزل آج بھی اسی طرح مقبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس سماجی و سیاسی تناظر میں لکھی گئی تھی جب ہندوستان بھر میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور بلوچستان میں لوگوں کو ان کے کم از کم بنیادی انسانی حقوق یعنی سیاست میں حصہ لینا اور آزادی اظہار تک حاصل نہ تھے۔ ہندوستان کی سطح پر قائد اعظم محمد علی جناح علامہ اقبال اور دوسرے مسلم لیگی رہنما بلوچستان کے سیاسی حقوق کے لیے اپنی آواز اٹھا رہے تھے جبکہ بلوچستان میں یوسف عزیز مگسی، صمد خان اچکزئی اور دیگر اکابرین تحریر و تقریر سے اس مشن کو آگے بڑھا رہے تھے۔ یوسف عزیز مگسی وہ پہلے شخص میں جنہوں نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلوچستان کو ایک معروض کے طور پر بیان کیا بلکہ اپنی قوم کو شعور دینے کے لیے شاعری کو پیغام کا ذریعہ بنایا۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو وہ اس وقت مولانا حالی، اقبال اور ظفر علی خان کے پیروکار تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی تخلیقی زندگی کے ابتدائی دور میں گل خاں نصیر انہی لوگوں کے زیر اثر رہے۔ انہوں نے یوسف عزیز مگسی اور محمد حسین عنقا کی طرح شاعری میں اپنی قوم کے زوال کو نہ صرف بیان کیا بلکہ انہیں سیاسی شعور سے بہرہ ور کرنے کی کوشش بھی کی۔ ایک طرح سیانہوں نے اقبال و حالی کے تتبع میں اہل بلوچستان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا۔ اس حوالے سے ان کی معروف غزل یوں ہے۔

آ گیا وقت امتحانِ بلوچ — اب ہے کچھ اور آسمانِ بلوچ
قید سے کیوں انہیں ڈراتے ہو — طفلِ ناداں نہیں جوانِ بلوچ
خوفِ زنداں نہیں بلوچوں کو — جان پر کھیلنا ہے شانِ بلوچ
ملک و ملت کے واسطے قربان — مال و دولت عزیز و جانِ بلوچ
ہوئے گی آخر ایک دن آزاد — آج گر بند ہے زبانِ بلوچ
زورِ باطل سے دب نہیں سکتا — دیکھ لے ! آزما! کمانِ بلوچ
کچھ نہیں ہے مگر خدا کے سوا — جس سے قائم ہے آن بان بلوچ
رکھ توقع نصیر خالق پر — ہے وہ خلاق پاسبانِ بلوچ

یہ غزل لکھتے وقت گل خاں نصیر کی عمر بیس سال تھی۔ اس غزل یا غزلِ مسلسل کی جامعیت، ندرت اور سیاسی و مقامی حوالے

کے با کمال اظہار سے خیال آتا ہے کہ یہ گل خاں نصیر کی اولین اُردو تخلیق نہیں ہوسکتی ۔وہ ضرور اس غزل کی تخلیق سے پہلے طبع آزمائی کرتے رہے تھے۔یہ اور بات ہے کہ ان کا ایسا کلام اب ہمارے سامنے نہیں ہے۔

شاید انہوں نے اپنے کلام کا انتخاب کرتے ہوئے ابتدائی کلام خود ضائع کردیا ہو یا پھر ان کے رفقا نے ان کی بعض ابتدائی نوعیت کی تخلیقات کو فنی یا لسانی کمزوریوں کے سبب اہم نہ سمجھا ہو۔ اگر واقعی ایسی کوئی بات ہے تو ان کی ابتدائی تحریروں کو ضرور منظر عام پر آنا چاہیے۔ اگر غالب جیسے بڑے شاعر کی آٹھ دس سال کی عمر میں پتنگ بازی پر لکھی ہوئی مثنوی دستیاب ہوسکتی ہے جس کا زمانۂ تحریر اندازاً ۱۸۰۷ء بتایا جاتا ہے ۔اور اس سے غالب جیسی شخصیت کے مقام و مرتبے میں کوئی فرق نہیں پڑا تو بلوچی کے 'ملک الشعراء' کے اولین اُردو کلام تک رسائی کیوں نہیں ہوسکتی ۔یقیناً اس سے نصیر کے مقام مرتبے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ پھر گل خان نصیر نے تو آٹھویں جماعت کے دوران براہوی میں پوری ایک منظوم کتاب لکھ ڈالی تھی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس وقت یعنی قریباً ۱۳، ۱۴ سال کی عمر سے ۲۰ سال کی عمر تک انہوں نے اُردو میں کچھ نہ کہا ہو۔ چنانچہ بلوچستانی ادب کے سنجیدہ طالب علموں اور محققین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نصیر کے اولین اُردو کلام کا سراغ لگا کر اسے منظر عام پر لے آئیں۔تب ہی ان کی اُردو شاعری کے صحیح دور کا تعین ممکن ہوگا۔

نصیر کے مجموعہ کلام کارواں کے ساتھ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے جو پہلی حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ ان کے اُردو کلام کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔ ان میں صرف سات آٹھ ایسی غزلیں ہیں جو اگرچہ ہیں تو غزل کی ہئیت میں تاہم انہیں غزل مسلسل کہنا بہتر ہوگا ۔کیونکہ ان میں ایک ہی خیال کی روملتی ہے اور یہ اپنے مزاج میں غزل کی بجائے نظم کے قریب ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نصیر بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ ان کا شمار بلوچستان میں اُردو نظم کے ان بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے پہلے پہل یہاں اُردو نظم کو باقاعدہ رواج دینے کی کوشش کی۔ ایسے دیگر لوگوں میں یوسف عزیز مگسی اور محمد حسین عنقا کے نام شامل ہیں۔نصیر کی نظمیں بہ لحاظ ہیئت پابند، معری، مثنوی، آزاد نظم اور غزل کی صورت میں ملتی ہیں۔ جبکہ موضوعات کے حوالے سے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ بلوچستان سے محبت، ظالمانہ رسم و رواج اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمے ، بلوچوں کی آزادی و بقا اور بہتر مستقبل کے خوابوں پر مشتمل ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان کی سوچ مقامیت سے بالا تر ہوکر بین الاقوامی سطح پر اپنا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔تب ان کے موضوعات طبقاتی تقسیم کے ناروا مظاہر، عدم مساوات، ترقی پسندی، عالمی بھائی چارہ اور امن عالم کی خواہش بنتے ہیں۔

بلوچستان اور بلوچ قوم سے محبت نصیر کی رگوں میں خون کی مانند رواں نظر آتی ہے اسی جذبے کے تحت وہ خوانین قلات کے انگریزوں سے معرکے پر طویل نظمیں لکھتے ہیں اور بلوچ سر زمین کے سپوتوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ جنہوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے دو بدو لڑتے ہوئے اپنی زندگی کی قربان کی۔ ان کی ایسی دو نظمیں شہادت خان محراب خان اور شہادت میر مہراب خان غازی کے عنوانات سے ہیں جو سادہ منظوم بیانیے پر مشتمل ہیں۔ اسی پیرائے میں ان کی دیگر دو نظمیں 'یاد اسلم' اور 'بوفات نواب یوسف علی خاں مرحوم' ہیں۔ جو ہر دو شخصیات کی وفات حسرت آیات اور بلوچستان میں ان کے ترقی پسندانہ شخصی کردار سے متعلق ہیں۔لیکن ان کی شاعری صرف گزرے ہوئے لوگوں کے نوحے لکھنے تک محدود نہیں۔ بلکہ وہ بلوچوں خصوصاً نوجوان بلوچ کو بیداری اور حرکت کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔ وہ اپنے علاقے اور وطن کی کسمپرسی اور پسماندگی کا ذمہ دار جاگیرداری اور سرداری نظام کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کئی نظموں میں طبقاتی نظام اور عدم مساوات کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس ذیل میں ان کی دو نظمیں 'راج کرے سردار' اور 'قبائلی سرداروں سے' بالخصوص قابل ذکر ہیں۔نظم 'راج کرے سردار' سے دو بند ملاحظہ ہوں:

بچے رو رو نین گنوائیں
بوڑھے در در ٹھوکر کھائیں
چھپ چھپ مائیں نیر بہائیں
بھیک ملے نہ ادھار۔ رے بھیا
راج کرے سردار
بلک بلک کر بچے روئیں
بھوکے پیٹ سجنوا سوئیں
سجنی گھر کی لاج ڈبوئیں
توند بھرے زردار۔ رے بھیا
راج کرے سردار (۱۵)

طبقاتی ناسور نہ صرف بلوچستان میں بھی موجود تھا بلکہ اب تک ہے ۔ اس دور کے ہندوستان بھر میں اس کی ہولنا کی نے معاشرے کو حد درجہ مایوس اور اضمحلال کا شکار کر رکھا تھا۔ آج بھی جاگیر دارانہ سماج اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام ہی دراصل پاک و ہند کے بڑے مسائل میں سے ایک ہے۔ جس کی بدولت کئی حوالوں سے ان ہر دو ممالک کے معاشروں میں انتشار، بے چینی اور بد امنی فروغ پاتے رہے ہیں۔ شاہ محمد مری اس حوالے سے گل خاں نصیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گل خان کی اُردو شاعری طبقاتی حوالے سے بہت ڈائریکٹ اور واضح ہے وہ اپنی اُردو شاعری میں کھل کر مزدور، کسان اور عام بلوچ کے گن گاتے ہیں۔ وہ سرداروں، زرداروں کی مخالفت کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر کرتے ہیں۔ سامراج دشمنی ان کی اُردو شاعری کا ایک توانا ستون ہے۔''۔ (۱۶)

گل خاں نصیر طبقاتی نظام کے خلاف ہی 'غزل سرا' نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے قبائلی معاشرے اور روایتی سماج میں پائے جانے والے غلط اور مکروہ رسم و رواج کے خلاف بھی کھل کر نعرۂ حق بلند کرتے ہیں۔ چاہے وہ شادی کے حوالے سے لب ولور کی بات ہو یا جرگہ سسٹم کی خرابیاں، جس سے آئے دن ان کے اہل وطن اور عام بلوچ دوچار ہوتے ہیں۔ یہ ایسی رسومات ہیں جو عرصہ قدیم سے قبائلی معاشرے میں چلی آتی ہیں اور آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ جرگہ سسٹم قبائلی نظام کی اہم علامت ہے۔ یہ ایک طرح کا متوازی عدالتی نظام ہے جس میں مختلف قسم کے جھگڑوں کا تصفیہ قبائلی سرداروں اور روساء کا اجلاس کرتا ہے۔ اس کے حق و مخالفت میں آج بھی وزنی دلائل دیے جاتے ہیں۔ تاہم برسرزمین دیہات بلکہ شہروں میں بھی اکثر فیصلے ان جرگوں کے ذریعے ہوتے ہیں۔ گل خاں نصیر اور ان کے رفقا و ہمعصر مثلاً یوسف عزیز مگسی عبدالعزیز کرد، عبدالصمد خاں اچکزئی اور دیگر نہ صرف جدید تعلیم سے بہرہ ور تھے بلکہ ان کا شعور حد درجہ ترقی یافتہ تھا یہ لوگ نہ صرف پرانے رسم ورواج کا خاتمہ چاہتے تھے بلکہ بنیادی انسانی حقوق کے پر جوش علمبردار تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے اہل وطن ان رسوم بد کے ہوتے ہوئے شرفِ انسانیت سے صحیح طور پر روشناس نہیں ہوسکتے۔ اس پر مستزاد یہ حقیقت کہ اُس عہد کی انگریز سرکار ایسے قبائلی جرگوں کو اپنے مذموم اور نو آبادیاتی مقاصد کے لیے بے دریغ استعمال کر رہی تھی۔ مثلاً

یوسف عزیز مگسی کو ۱۹۳۰ء میں صرف ایک مضمون لکھنے کی پاداش میں ہزاروں روپے جرمانہ اور ایک سال کی نظر بندی کی سزا جرگے کے ذریعے دی گئی ۔گل خاں نصیر اپنے ساتھیوں اور ابنائے وطن پر جرگے کے نام پر ہونے والے ظالمانہ سلوک پر کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اس ظلم کے خلاف اپنے جذبات کا منظوم اظہار یوں کیا:

ہماری شومئی قسمت کی اک تصویر ہے جرگہ — بلوچوں کے مٹانے کی یہ اک تدبیر ہے جرگہ
ہوا حُب وطن کے جرم کا جو شخص بھی عاصی — تو اس کا سرا اڑانے کے لیے شمشیر ہے جرگہ
جنہیں خواہش ہے صحرائے وطن میں لالہ کاری کی — انہیں نخچیر کرنے کے لیے اک تیر ہے جرگہ
یہ جرگہ دشمن آئین و قانون و شریعت ہے — ہمارے واسطے اک دوزخی تعزیر ہے جرگہ (۱۷)

گل خاں نصیر کی اس طرح کی غزلوں یا نظموں میں ان کا سماجی وسیاسی شعور اپنی ارفع شکل میں نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں مقامی لفظیات، دھرتی کی بوباس سے آشنا لہجہ، زمین کے مسائل، اور موضوعات کو نظم کرنے کا میلان حاوی نظر آتا ہے۔ دراصل گل خاں نصیر کے عہد میں دنیا بھر کی نو آبادیات میں غلامی سے آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ جگہ جگہ عوام اپنے تئیں انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد میں عملاً شریک تھے۔ کہیں کہیں وہ اس کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے مثلاً روس میں۔ ہندوستان میں بھی سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ نصیر نہ صرف عالمی سطح پر ہونے والی ان تبدیلیوں سے آگاہ تھے بلکہ وہ خود بھی اپنے سماج اور علاقے کی حد تک عملاً اس تحریک آزادی میں شامل تھے۔ بلوچستان بھی نصیر اور ان کے ساتھیوں کے توسط سے نئی کروٹ لے رہا تھا۔ عوام میں سیاسی شعور کی بیداری کی مہم میں کئی راہنما پابندیوں کے باوجود تحریر وتقریر کے ذریعے حصہ لے رہے تھے۔ سیاسی حوالے سے نصیر ہراول دستے میں شامل تھے ۔اس پر مستزاد وہ شاعری کا ملکہ بھی رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی شاعری میں ایک بڑے مقصد کو پیش نظر رکھا اور پھر ساری عمر اس پر کار بند رہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

> ''میرے خیال میں ایک شاعر جسے اپنے وطن اور قوم کا درد ہو، سب سے زیادہ اثر اپنے اطراف میں پھیلے ہوئے لوگوں کی بدحالی پسماندگی اور قومی جبر سے قبول کرتا ہے۔ میری شاعری بنیادی طور پر اپنے عوام کی مادی اور ذہنی پسماندگی اور ان سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کا عکس ہے۔'' (۱۸)

آخری سطر میں نصیر نے گویا اپنا نظریۂ فن بیان کر دیا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی ساری اُردو شاعری بلکہ بلوچی شاعری بھی ان کی اس بات کی شاعرانہ یا منظوم تفسیر ہے۔ شاید ہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی شاعری میں قلبی واردات یا غم جاناں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ نصیر نے عشق مجازی کا دروازہ خود پر بند کر رکھا تھا انہوں نے کبھی اس رنگین دروازے سے جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ ان کی کوئی محبوبہ نہیں ہے یا کم از کم اردو شاعری کی حد تک نہیں ہے ۔جس کی اداؤں سے انہیں پیار ہو یا جس کے حُسن کے ترانے نصیر نے گائے ہوں ۔کوئی ایسا مٹی کا پیکر یا آسمانی پری جس نے نصیر کے دل کو گدگدایا ہو نظر نہیں آتی۔ یہ بات ایک شاعر کے حوالے سے حیرت انگیز ہے ایک ایسے ماحول اور علاقے میں جس کی شعری روایت میں محبوبہ کے تذکروں سے دیوان بھرے پڑے ہوں۔ مثلاً بلوچستان میں ہی سمو کے حوالے سے مست کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ مگر نصیر اس حوالے سے بالکل الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے ان کے تمام سروکار بلوچ عوام اور ان کی امنگوں سے ہیں ۔ وہ اپنی آنکھوں میں ہمیشہ عوام کے خواب سجاتے رہے۔ شاید اردو شاعری کی روایت میں نصیر تنہا شاعر ہے۔ جس کی شاعری میں عشق مجازی کے حوالے سے ایک شعر نہیں ملتا۔ ایک

بھی ایسا شعر جس میں حسن و عشق کے لطف یا وصل و ہجر کا بیان ہو۔ شاعری میں نصیر کی صرف ایک محبوبہ ہے اور وہ ہے ان کی سر زمین بلوچستان ۔جس کے ترانے وہ پہلے اردو اور بعد میں بلوچی میں گاتے رہے۔

جہاں تک مختلف شعراء کے اثرات کا تعلق ہے تو نصیر کے کلام میں ہمعصر اور ماقبل کے کئی اُردو شعرا کے رنگ اپنی ہلکی سی چھب دکھاتے ہیں۔نصیر پر لکھنے والوں نے اپنے مضامین میں حالی، اقبال اور یوسف عزیز مگسی کے ان پر اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ خود اس بارے میں رقمطراز ہیں:

''کچھ عرصہ علامہ اقبال سے متاثر رہا مگر ادب کے حوالے سے میں نے سب سے زیادہ اثر ۱۹۳۶ کی ترقی پسند تحریک سے لیا۔'' (۱۹)

حالی کے اثرات ان کی دو نظموں 'مرے دیس کے نواجوں سو رہے ہیں' اور 'نوائے وقت' میں زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ جبکہ یوسف عزیز مگسی کے اثرات مختلف نظموں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔خصوصاً ان کی نظم 'حلف نامۂ آزادی' سراسر یوسف عزیز کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ جہاں تک اقبال کے اثر کا تعلق ہے تو یہ گل خاں نصیر کی شاعری میں واضح نظر آتا ہے۔ البتہ ان کے ہاں اقبال جیسی بلند خیالی، بلند آہنگی اور خطابیہ لہجہ نہیں ملتا۔ نہ ہی ان کے ہاں اقبال ایسی وسعتِ خیال اور موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ ان کے کلام میں جا بجا ایسے الفاظ اور تراکیب ملتی ہیں جن میں کلامِ اقبال سے استفادہ کی جھلک نظر آتی ہے۔مثلاً حُبِ وطن، صحرائے وطن، تیغِ جوہر دار، مردِ مجاہد، خاکِ مذلت، مست خرام، رندِ کہن، مغربی نبات، دشتِ ناپیدا کنار، محنتِ پیہم، طائرِ مردار خور، نعرہء لادینی و مستانہ، قطرۂ بے مایا، اندازِ جہاں داری، ابنائے وطن ، شہبازِ خاراں، پیروئ درسِ قراں، تعمیرِ جہانِ نو، تازہ جہاں، اور دستور کہن وغیرہ۔ ان الفاظ و تراکیب میں اقبال کا عکس صاف نظر آتا ہے۔مگر یہ صرف تراکیب تک ہی محدود نہیں بلکہ نصیر کے مصرعوں، شعروں اور نظموں میں بھی اقبال کے لہجے کی بازگشت ملتی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ نصیر پر فیض اور حفیظ جالندھری کے اسالیب کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی ایک نظم 'ایثارِ رائیگاں' نہ صرف فیضؔ کا لہجہ بلکہ ان کی معروف نظم 'صبح آزادی' کا مضمون ظاہر کرتی نظر آتی ہے۔'ایثار رائیگاں' کے چند بند ملاحظہ ہوں:

مجھ سے اے دوست گرانبارئ امروز نہ پوچھ
میرے افکارِ پریشاں کو پریشان نہ کر
میرے جذبات پہ احساس کے چرکے نہ لگا
میری بگڑی ہوئی تقدیر پہ ارمان نہ کر
غم نصیبوں کا یہاں مونس و غم خوار کہاں
کس سے ہم اپنے غم و رنج کا اظہار کریں
ہم غریبوں کے لیے طالعِ بیدار کہاں
کیسے ہم قسمتِ خوابیداہ کو بیدار کریں
کیا یہی تھی وہ تمنا، وہ سرِ رشتہ کار

جس پہ ابنائے وطن بھینٹ چڑھائے لاکھوں
کیا اسی خواب کی تعمیر اجاگر کرنے
سربکف ہوکے گھر وبار لٹائے لاکھوں (۲۱)

جبکہ حفیظ جالندھری کے اثرات کی ذیل میں نصیر کی وہ مختصر بحر کی نظمیں آتی ہیں ۔جو بہت رواں، مترنم اور موسیقیت سے لبریز ہیں۔ ان میں اُٹھ اے بلوچ نوجواں، جھک نہ جائے یہ علم، بلوچ کا گیت اور یہ تو پرانی ریت ہے ساتھی وغیرہ شامل ہیں۔نظم 'اُٹھ اے بلوچ نوجواں' کے چند بند اس بات کی وضاحت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں:

سپیدہ دم ہوا عیاں بڑھا چلا وہ کارواں
یہ کہہ رہا ہے سارباں نہیں یہ خواب کا سماں
تو کارواں کے ساتھ چل بڑھا کے قوتِ عمل
نہ ہو جہاں میں مضمحل کہ کاہلی میں ہے خلل
یہ قید وبندِ جاں گسل نکل تو ان کو توڑ کر
صبو وجام چھوڑ کر نشاط و عیش چھوڑ کر
دلوں کو دل سے جوڑ کر حوادثوں کو موڑ کر
تو مردِ کار زار بن شجاع و شہسوار بن
دلیر و جاں نثار بن جوانِ کامگار بن
عدو پہ برق بار بن جلا کے ان کو خاک کر
وطن کو ان سے پاک کر قبائے رسم چاک کر
نہ خوف کر نہ باک کر لگا نشانہ تاک کر(۲۲)

فیض وحفیظ کے یہ اثرات بتاتے ہیں کہ طبعِ نصیر نے ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے۔گل خاں نصیر کی شاعری کا ایک حیرت ناک پہلو ہندی الفاظ کا کثیر اور متواتر استعمال ہے۔ ان کی مختلف نظموں میں ہندی الفاظ کا استعمال بالکل فطری محسوس ہوتا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو وہ ہندی زبان سے واقف تھے ۔اوریا پھر کلاسکی اُردو میں استعمال ہونے والے ہندی الفاظ اور ان کے مزاج سے پوری طرح آشنا تھے۔ یہ الفاظ ان کی نظموں میں اجنبی محسوس نہیں ہوتے بلکہ ان کے شعروں میں پوری طرح جذب اور گندھے ہوئے لگتے ہیں۔ ان ہندی الفاظ سے ان کی نظموں میں روانی اور موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔یعنی وہ ہندی الفاظ تخلیقی سطح پر برتنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان الفاظ میں نین، نیر، سجنوا، سجن، بچار، ویت، نیاری، جتنا، اوتار، بھکشا، نیا، آشا، انیائے، دھنوان، بھگوان، ایمان، پرجا، پاپی، دُشت، بدھی اور سیوک وغیرہ ہیں۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ ان میں سے بیشتر الفاظ جن نظموں میں استعمال ہوئے ہیں وہ گل خاں نصیر کی بہترین تخلیقات میں سے ہیں۔ اسلوب کے حوالے سے بھی اور موضوع کے اعتبار سے بھی۔ یہاں گل خاں نصیر مقامیت سے اوپر اٹھتے ہوئے آفاقی سطح پر بات کرتے اور مسائل کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔

اگر گل خاں نصیر کے اُردو کلام کے حوالے سے ان کی نمائندہ نظموں کی بات کی جائے تو ان میں ان کی پہلی وہ دو غزلیں بھی

شامل ہوں گی جو بلوچ اور جرگہ کے حوالے سے غزل مسلسل کہلائیں گی۔ ان میں سے پہلی 'آ گیا وقتِ امتحانِ بلوچ' اور دوسری 'ہماری شومئی قسمت کی اک تدبیر ہے جرگہ' کے مصرعوں سے بالترتیب شروع ہوتی ہیں۔ دیگر اہم نظموں میں راج کرے سردار، بولان، کون چلے یہ چال، نوائے وقت اور اُٹھ اے بلوچ نوجوان شامل کی جاسکتی ہیں۔ ان نظموں میں نصیر کا فن اپنی اعلیٰ شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ ان کا بیشتر کلام عمومی لب و لہجے اور مختلف مضامین کو منظوم انداز میں بیان کرتا نظر آتا ہے۔ جبکہ وزن اور بحر کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے مسائل بھی بعض جگہ ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ کئی جگہ تو فصاحت کا کم سے کم ادبی معیار تک نظر نہیں آتا مثلاً اس مصرعے میں دیکھیے ع رہِ طلب میں خراب ہوکر میں دل کی بتی جلا رہا ہوں

یہاں دل کی بتی کی ترکیب مصرعے کو غارت کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بعض ایسے نکات ان کی اردو شاعری کے کمزور پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ تاہم ان فنی کوتاہیوں کے باوجود بلوچستان کی شعری روایت کے تناظر میں گل خاں نصیر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو شاعری میں تخلیقی سطح پر بلوچستان کے تاریخی، ثقافتی اور جغرافیائی خط و خال کو اجاگر اور مصور کرنے میں اولیت کا سہرا بھی گل خاں نصیر کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے اُردو شاعری کو بلوچستان کے ان متنوع رنگوں سے آشنا کیا۔ جو اس سے پہلے نا پید تھے اور پھر جن سے بلوچستان کے بعد کے شعراء مثلاً عین سلام، عطا شاد اور دیگر نے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر اپنی شاعری کا ہنر کدہ سجایا۔ ان کی ایک مختصر اور نا تمام نظم 'بولان، اس حوالے سے بطور مثال پیش کی جاتی ہے یاد رہے اس کا زمانہ تخلیق ۱۹۴۸ء ہے۔

خشک و بے مہر چٹانوں کا تراشیدہ حصار
تپشِ مہر سے جھلسی ہوئی سنگین دیوار
جھریاں چہرۂ پرہول پہ ادواروں کی
گھاؤ رستے ہوئے، شمشیر سے قہاروں کی
پیرِ فرتوتِ کہن سالہ زابل کی طرح
بھنویں سکڑی ہوئی ابھرے ہوئے ماتھے پہ تناؤ
جیسے کوہزاد سے رستم کے بگڑ جانے پر
اس نے زابل کے بلوچوں پہ نظر ڈالی تھی!
اس طرح آج بھی بولان کی گھاٹی ہر دم
اُسی مشتاق مگر تند نظر سے ہم کو
دیکھتی ہے کسی کو ہزاد سے ٹکرانے کو ۲۳

اس نظم کا شمار گل خاص نصیر کی اہم نظموں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس طرح کی نظموں کی تخلیق سے بلوچستان میں اُردو میں نظم کی روایت کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ اس میں نئے امکانات کا در کھولا۔ جس سے آنے والے سالوں میں یہاں نظم کی روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مقدار میں نہایت قلیل ہونے اور اپنی تمام تر فنی کمزویوں کے باوصف گل خاں نصیر کی شاعری نے بیسویں صدی میں بلوچستان میں اُردو شعری روایت کو استحکام بخشنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر وہ اُردو شعر گوئی قصداً ترک نہ کرتے اور اسے سنجیدگی سے ذریعہ اظہار بنائے رکھتے تو ان کے تخلیقی امکانات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ آج اُردو کے ایک اہم شاعر ہوسکتے تھے۔

## حواشی وحوالہ جات

۱۔ عبدالصبور، ورثہ، بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ، ۲۰۰۵، ص ۱۷۔

۲۔ گل خاں نصیر، میں اور میرا فن، مشمولہ اخبار اُردو، جلد ۱۹، شمارہ، جلد ۱۱، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۴۷۔

۳۔ بزدار، واحد بخش، میر گل خاں نصیر شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۶، ص ۳۴، ۳۵۔

۴۔ ایضاً ص ۳۵، حواشی میں مصنف نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس بات کا انکشاف ان پر یوسف عزیز مگسی نے ایک بالمشافہ ملاقات میں کیا۔ تاہم انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ آیا یہ کہیں شائع ہوئی تھی یا قلمی صورت میں موجود ہے یا پھر ضائع ہوچکی ہے۔

۵۔ ناصر، آغا محمد، ڈاکٹر، بلوچستان میں اُردو شاعری، کوژک پبلشرز کوئٹہ، ۲۰۰، ص ۹۸۔

۶۔ ایضاً ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲۔

۷۔ شیخ، نور: مرتب: میر گل خاص نصیر شخصیت، شاعری اور سیاست، عوامی ادبی انجمن، کراچی ۱۹۹۳، ص ۶۷۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ڈاکٹر شاہ محمد مری نے نہ صرف دیباچہ لکھا ہے بلکہ 'کارواں کے ساتھ' کی اشاعت انہی کی مرہون منت ہے ان کے بقول یہ ذمہ داری گل خاں نصیر کی صاحبزادی گوہر ملک نے ان کے سپرد کی تھی۔

۱۰۔ یوسف رجا چشتی، ۲۰۰۳، ص ۸۶۔

۱۱۔ شیخ، نور محمد، ۱۹۹۳، ص ۴۳۔

۱۲۔ بزدار، ص ۱۷۔

۱۳۔ ایضاً ص ۱۲،

۱۴۔ نصیر، گل خاں، کارواں کے ساتھ، مہر در پبلیکیشنز، کوئٹہ، ۲۰۱۱، ص ۲۸۔

'کارواں کے ساتھ' میں 'جس' کی بجائے 'جب' ہے اور مصرعہ یوں ہے۔ جب سے قائم ہے آن بان بلوچ، جبکہ آغا محمد ناصر کی کتاب 'بلوچستان میں اُردو شاعری' میں 'جب' کی بجائے 'جس' ہے دیکھیے صفحہ ۱۰۱۔ یہی مفہوم کے لحاظ سے قرین قیاس ہے۔ ہوسکتا ہے 'جب' پروف کی غلطی سے در آیا ہو۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۵۔

۱۶۔ ایضا، ص ۱۲۔

۱۷۔ طاہر، سیمی نغمانہ، ڈاکٹر، بلوچستان میں ابلاغ عامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۲۰۰۶، ص ۱۶۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۱۸۔ بزدار، ص ۹۷۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ واحد بخش بزدار کی کتاب میر گل خاص نصیر شخصیت اور فن میں یہ نظم بعنوان 'عمر رائیگاں' موجود ہے دیکھیے۔ ص ۱۰۲۔

۲۱۔ نصیر، ۲۰۱۱ء، ص ۸۲۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۳۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۶۸۔